پورنی مم چھنتا چورنی۔ دور نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ گلی اسی طرح خاموش تھی۔ ہاں گلستان محل کے اندر سے بطخوں کی سراسیمہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس سناٹے میں بطخوں کی پریشان پکار اور اس آن مجھے دھیان آیا کہ ناند میں پانی نہیں بھرا گیا تھا۔ بطخیں پیاسی ہیں۔ ایک اکیلی بطخ گلی میں بھٹک رہی تھی۔ گلستان محل کا پھاٹک تو مقفل تھا۔ یہ بطخ کیسے باہر نکل آئی۔ مگر اس کا باہر نکل آنا بے سود ثابت ہوا۔ گلی میں بھی کہیں پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ قافلہ سے بچھڑی ہوتی پیاسی بطخ کہ نہ واپس قافلہ میں جا سکتی تھی نہ دور نکل سکتی تھی۔ اندر سے پیاسی بطخوں کی پکار آتی اور وہ آگے جاتے جاتے ٹھٹھکتی اور منقار آسمان کی طرف بلند کر کے دردناک آواز میں جواب دیتی۔ کتنی دور تک کتنی دیر تک وہ پکار مرا تعاقب کرتی رہی، میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ قائیں قائیں قائیں قائیں قائیں قائیں۔ تب گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک سوار باحال پریشاں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا چلا آ رہا تھا۔ قریب آکر باگیں کھینچیں۔ "عزیز پیاسا ہوں۔ پانی کی طلب رکھتا ہوں۔"

میں نے جواب میں اپنی پانی کی چھاگل کھولی۔ کوزہ بھر کر اس تشنہ لب کو پیش کیا۔ سوار نے اتر کر گھوڑے کو درخت کے تنے سے باندھا۔ بیٹھ کر پانی پیا، خدا کا شکر ادا کیا۔

تب میں نے استفسار کیا کہ اے مرد مسافر، بیان کر کہ تو کس سمت سے آتا ہے اور کس سمت میں جاتا ہے۔

اس نے جواب میں آہ سرد بھری اور یوں گویا ہوا کہ اے عزیز، میں شہر تیرہ بخت اصفہان نصف جہان کی سمت سے آتا ہوں اور ادھر جاتا ہوں جدھر میرا رب مجھے لے جائے۔

میں نے تامل کیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے استفسار کیا کہ اے اصفہان نصف جہان

کی سمت سے آنے والے کچھ اصفہان نصف جہان کا احوال بیان کر۔

یہ سن اس مرد اجنبی نے پھر آہ سرد بھری اور یوں گویا ہوا کہ "اے اصفہان نصف جہان کا حال پوچھنے والے، میں اس باب میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جب میں اس دیار سے نکلا ہوں تو ابھی کھوپڑیوں کا مینار اُدھورا تھا کہ اصفہان کی کچھ گردنوں پر ابھی سر باقی تھے اور ابھی سب گھروں میں خاموشی نے گھر نہیں کیا تھا کہ ہنوز کتنی حویلیوں سے عورتوں کے بین اور بچوں کے بلکنے کی آوازیں آ رہی تھیں"۔

میں نے یہ سنا اور ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تامل کیا، پھر رُکتے رُکتے سوال کیا کہ "اے اصفہان نصف جہان سے آنے والے کیا تیرا گذر بیت الابیض کی طرف سے بھی ہوا؟"

"ہاں ہوا۔ میں جب ادھر سے گذرا ہوں تو وہ ایوانِ بلند و بالا شعلوں کی لپیٹ میں تھا اور اندر سے صرف گھوڑوں کے ہنہنانے کی مضطرب آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے رسہ تڑا کر بھاگ نکلنے کے لئے تڑپ رہے ہوں"۔

تب میں نے گریہ کیا اور میں نے بکا کی' اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ خَیر۔ سوال سب بے سود۔ گریہ دعا بکا کا فائدہ معلوم۔ میرے تین بڑے افسوس ہیں۔ پہلا افسوس گلستان محل کی پیاسی بطخوں کے لئے کہ کاش چلتے وقت میں ان کی ناند میں پانی بھر آتا۔ دوسرا افسوس شاما چڑیا کے لئے جسے میں نے سدا منڈیر پہ چہکتے دیکھا، اسے پکڑ نہیں سکا۔ تیسرا افسوس .... خیر تیسرے افسوس کا اب کیا ذکر۔ اب وہ بستی نہ وہ دریا نہ وہ لوگ جانے اُن بالا قد گھوڑوں پہ کیا گذری۔ وہاں تو اَب یہ بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کھوپڑیوں کا مینار کہاں کھڑا کیا گیا تھا۔ قصرِ ریحان کی فصیلیں کتنی خستہ ہو چکی تھیں۔ کتنی کا ہی اُن پر جم چکی تھی۔ کوئی ہے، کوئی ہے، کوئی ہے۔ میں پکارا کیا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ پیاسی بطخیں پانی کی تلاش میں جانے کس طرف نکل گئیں۔ بس منڈیر پہ ایک کوا

گم سم بیٹھا تھا۔ اس کے ایک بازو کے سارے پر سفید ہو چکے تھے۔ اس نے کتنی اجنبی نظروں سے مجھے دیکھا اور کتنی خاموشی سے اُڑ گیا۔ تب میں نے افسوس کیا۔ میرا تیسرا بڑا افسوس۔ میرا سب سے بڑا افسوس یہی ہے۔ اے جہان آباد، اے گلستان محل، اب تیری اُجاڑ منڈیروں پہ بیٹھنے والے کوے بھی مجھے نہیں پہچانتے۔ سو میں نے جانا کہ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ مگر خیر میں تو شاما سے شروع ہوتا ہوں۔ شاما او شاما سے۔ شیریں کی بچی، اس نے اگر عین وقت پہ گڑبڑ نہ کی ہوتی تو شاما میری مٹھی میں تھی۔ وہ ایک ساعت تھی کہ پلک جھپکتے آئی اور گذر گئی۔ میں اس چوک کو کبھی نہیں بھول سکا۔ ایک بڑا پچھتاوا میری قسمت میں لکھا گیا۔ عمر اس حسرت میں گذری کہ وہ ساعت کاش پھر آئے۔ اس وقت میں یہی سمجھا تھا کہ وہ ساعت پھر آگئی ہے اور اب یہ ساعت میری مٹھی میں ہے۔ زندگی میں آنے والی ساعت اسی طرح جل دیتی ہے۔ پتہ چلا کہ ساعت ایک مرتبہ چٹکی سے نکل جائے تو دوبارہ درشن بھی دے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پچھتاوے میں اُلٹا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اے شہر خوبی، اتنے دن گذرنے پر یہ بھید نہ کھلا کہ تو کون ہے، کہاں سے آئی ہے، رات کو جب وصل کی گھڑیاں قریب آتی ہیں تو کس پردے میں چلی جاتی ہے۔ وہ نازنین یہ سن، آگ بھبھوکا ہوئی اور بولی کہ اے نادان کیا تو نے قول نہیں دیا تھا کہ تو کچھ نہیں پوچھے گا۔ بولا، قول دیا تھا۔ مگر اب ضبط کا یارا نہیں، پوچھے بنا چارہ نہیں۔ نادان، یہ مت پوچھ۔ پچھتائے گا۔ پوچھوں گا۔ دیکھ مت پوچھ، پچھتائے گا۔ پوچھوں گا۔ تب وہ ماہ رو زمین میں لوٹی پوٹی اور کبوتری بن گئی پھر پھڑپھڑائی اور اُڑ گئی۔ تب حیرانی پریشانی بخت میں اس کے لکھی گئی۔ دربدر خاک بسر پھرتا تھا۔ اور پوچھتا تھا کہ وہ شہر خوبی کس دیس میں بستی ہے۔ ایک مرد پیر نے اسے دیکھا اور افسوس سے کہا کہ کمبخت تو نے جاننے کی کوشش کیوں کی تھی۔ کیا شربتِ دیدار تیرے لئے کافی نہیں تھا۔ اب وہ وہاں ہے جہاں پہنچنا تیرے مقدور میں نہیں ہے۔ کوہ قاف

سے آگے کوہ قاف ہے۔ اس سے آگے پھر کوہ قاف ہے۔ وہاں وہ قلعۂ بے در میں رہتی ہے۔ جہاں نہ آدم زاد پہنچ سکتا ہے۔ نہ پرندہ پر مار سکتا ہے۔ ہم کچھ نہیں جان پاتے۔ جاننے کی کوشش میں خراب ہوتے رہتے ہیں۔ خیران دنوں تو ہم دونوں ہی بے خبری کی جنّت میں تھے۔ کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ جب اس کے سینہ سے دوپٹہ ڈھلک کر نیچے گرا تھا تو مجھے بس ایک استعجاب ہوا تھا۔ وہ استعجاب ابھی تک برقرار ہے۔ استعجاب، استعجاب، استعجاب ــــ از کجا می آید ایں آوازِ دوست ــــ کہاں سے کیسے میں نے اسے دیکھا نہیں تھا۔ جب دیکھا تو میں نے کہا کہ یہ تو وہ نہیں ہے۔ جب جانا کہ وہی ہے تو پھر نہ صورت دکھائی دی نہ آواز آئی۔ آواز آخر کہاں سے آتی تھی، سمندر کے اُدھر سے یا پہاڑوں کے پیچھے سے یا پاتال سے وہ فقط آواز تھی۔ آواز میں اتنا سحر ہوتا ہے۔ میری زندگی میں خالی ایک آواز ہے، دور سے آتی ہوئی۔ ایک نرم شیریں آواز کہ دھیمی ہوتے ہوتے کان کے قریب آتے آتے سرگوشی بن جاتی تھی۔ بلند آہنگ رنگین مکالموں میں کیا رکھا ہے۔ ایک سرگوشی بہت ہوتی ہے۔ بشرطیکہ ہاں بشرطیکہ..... کتنی دور سے ایک خشک چوب سے گذر کر وہ شیریں آواز آتی اور ایک سرگوشی بن گئی۔ اس سرگوشی میں کیا کچھ تھا۔ پورا ایک شہر آرزو۔ ایک حرفِ شیریں سے کائنات میں کتنا آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ گم ہو جائے تو پھر یہ پوری کائنات ایک بہنگم شور ہے۔ زق زق بق بق چخ چخ۔ زدلا گولا غل غپاڑہ بھبھل بھوسا۔ شور بڑھتا جا رہا تھا۔ خبر شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ جس نے سنا اس طرف دوڑ پڑا۔ لگتا تھا کہ پورا شہر وہاں ٹوٹ پڑا ہے۔ تباہی بھی تماشے کا ذائقہ رکھتی ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کا تماشہ دیکھنے کو کب کب ملتا ہے۔ کھوپڑیوں کے مینار روز روز تو کھڑے نہیں ہوتے۔ ملبہ سے لاشیں برآمد کی جا رہی تھیں۔ کتنے جسموں میں ابھی جان باقی تھی۔ سانس چل رہا تھا۔ کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

آدمی بھی کتنی سخت جان مخلوق ہے۔ حیرت اور دہشت سے آنکھیں دیکھنے والوں کی پھٹی ہوئی تھیں۔ قیاس کے گھوڑے دوڑائے جا رہے تھے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

گھر میں داخل ہوا تو گویا شور کے جہان سے نکل کر خاموشی کے منطقہ میں داخل ہو گیا۔ حیران ہوا کہ باہر اتنا شور اندر اتنی خاموشی۔ کبھی یوں بھی تو ہوتا ہے کہ سارا ہنگامہ اندر ہوتا ہے۔ باہر سناٹا۔ داخل ہوتے ہی میری نظریں آج پہلے پچھواڑے والی دیوار پر گئیں۔ نادانستہ اسی طرف ہو لیا۔ یوں ہی دیوار سے دوسری طرف جھانکنے لگا۔ آج پہلی مرتبہ میں نے اپنی اس دیوار سے پرلی طرف جھانکا تھا۔ کتنا تعجب ہوا۔ جیل کی لمبی پُراسرار فصیل یہاں سے صاف نظر آ رہی تھی اور کتنی قریب محسوس ہوتی تھی۔ جیسے بس یہ رہی ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور چھو لو۔ ویسے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ دل میں کہا۔ زبیدہ یہاں کیا دیکھ لیتی ہے۔

زبیدہ نے برآمدے سے نکل کر مجھے تعجب سے دیکھا "ادھر کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں" جیسے میں کوئی غلط یا فضول سی حرکت کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں، فوراً ہی ادھر سے پلٹ پڑا۔

دونوں وقت مل رہے تھے۔ مولوی غلام رسول کے بتائے ہوئے وظیفہ کے مطابق بوجان کی تقلید میں زبیدہ نے چراغ جلایا اور دیوار کے پرلی طرف دیکھے بغیر منڈیر پر رکھا اور چلی آئی۔

"ہوا تیز ہے۔ بجھ تو نہیں جائے گا" مجھے یونہی ایک تشویش سی ہوئی۔ حالانکہ میں بوجان کے وقت سے یہ وظیفہ دیکھتا چلا آ رہا تھا اور مجھے کبھی اس کے جلنے بجھنے کے بارے میں تردد نہیں ہوا تھا۔

میرے کہنے پر زبیدہ نے بہت تشویش سے چراغ کی کانپتی ہوئی لو کو دیکھا۔ پھر جیسے اپنے آپ کو دلاسہ دے رہی ہو کہنے لگی "اس روز تو ہوا زیادہ تیز تھی۔ مگر

نہیں بجھا تھا۔"

اس روز؟ ہاں اس روز ہوا واقعی زیادہ تیز تھی۔ چراغ کی لو کتنی کانپ رہی تھی۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اتنی دھیمی ہو جاتی کہ بس اب بجھی کہ اب بجھی مگر جھونکا گذرنے کے بعد پھر تیز ہو جاتی۔ یہ اس روز کی بات ہے۔ جس روز پھانسی لگی ہے۔ اس روز بھی یہی صورت تھی۔ بہت شور تھا اور بہت سناٹا تھا۔ جہان آباد ایک بڑے شور کی زد میں تھا۔ گلستان محل میں ابھی تک سب موجود تھے۔ سوائے بزرگوار مولوی میثاق علی کے۔ مگر گلستان محل بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہاں بیچ بیچ میں کسی بطخ کی ہراساں پکار سنائی دے جاتی تھی۔ جب بزرگوار مولوی میثاق علی گھر سے نکلے ہیں تو یہ بطخیں ان کے پیچھے پیچھے قائیں قائیں کرتی ہوئی ڈیوڑھی تک گئی تھیں۔ بعد میں دیر تک چلاتی رہیں۔ جیسے جانے والے کو پکارتی ہوں۔ مگر اب خاموش تھیں۔ بس اچانک کوئی بطخ اپنی گردن اٹھاتی اور ایک ڈری سی قائیں کر کے چپ ہو جاتی۔ اب دونوں وقت مل رہے تھے اور بزرگوار مولوی میثاق علی کا مصلے خالی پڑا تھا۔ خالی مصلے کو دیکھ کر میری لکڑ دادی کی آنکھ بھر آئی۔ بہت روئیں۔ کتنی دیر تک روتی رہیں۔ اسی میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ صبح کو انہوں نے بتایا کہ "اے بی پچھلے پہر کو میری آنکھ کھل گئی۔ سامنے جو نظر گئی تو کیا دیکھوں ہوں کہ بھائی میثاق علی مصلے پہ بیٹھے تسبیح پھیر رہے ہیں۔ سفید براق کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ کیا بتاؤں چہرے پہ کیسا نور برس رہا تھا۔" تو اب صبح ہو رہی تھی اور میں تذبذب میں تھا کہ چراغ معمول کے مطابق شہر کے چراغوں کے ساتھ بجھا ہے یا رات کے کسی پہر میں تیز ہوا کا کوئی جھونکا اسے بجھا گیا۔

"زبیدہ"

"ہوں"

"وہ پراپرٹی ڈیلر پھر ملا تھا؟"

"اچھا؟"

"ہاں - وہاں جائے حادثہ پہ ایک خلقت ٹوٹی ہوئی تھی - وہاں وہ بھی نظر آگیا - میں نے اس سے آنکھ بچانے کی بہت کوشش کی - مگر ــــ خیر ــــ عجیب چیز ہے - جب ملتا ہے مجھے CONFUSE کر دیتا ہے - کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"مگر تم تو فیصلہ سنا چکے ہو" زبیدہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے - مگر کامریڈ سے جب میں نے ذکر کیا تو اس نے کچھ اور ہی کہا - کامریڈ خود CONFUSED آدمی ہے - مجھے بھی CONFUSD کر دیتا ہے۔"

"بخت مارا کامریڈ - مجھے تو وہ زہروں بُرا لگتا ہے - اصل میں تو اسی کے کہنے پہ تم بہکے تھے - اب وہ کیا کہتا ہے؟"

کامریڈ نے کیا کہا تھا - میں نے زبیدہ کو کچھ نہیں بتایا اور پریشان ہو جاتی - مگر میں نے سوچا کہ کامریڈ سے ایک مرتبہ کھل کر اس مسئلہ پہ بات کر لی جائے - اس وقت تو اس نے روا روی میں ایک بات کہہ ڈالی تھی کیا وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا - یہ محض اس کی فنوطیت تھی یا واقعی حالات ــــ خیر - کامریڈ سے چل کر بات کرنی چاہیئے - اس وقت تو اسے اپنے ٹھکانے ہی پہ ہونا چاہیئے - میں بس فوراً ہی نکل کھڑا ہوا - نقشہ باہر اور ہی دیکھا - خلقت کو سراسیمہ دیکھا - سروں کا سمندر اُمنڈا ہوا تھا - چاندنی چوک کی سمت میں بہتا تھا - میں حیران کہ یہ ماجرا کیا ہے، ہر فرد کیوں چاندنی چوک کی طرف دوڑا جاتا ہے - اے صاحبو - قفلِ دہن کو کھولو - منہ سے کچھ تو بولو - زبان کیوں سی رکھی ہے - حلق پہ تمہارے کس نے چھری رکھی ہے - معلوم تو ہو کہ اس نامبارک کوچہ میں اب کونسا گل کھلا ہے - کونسا آسمان ٹوٹا ہے اور میں رویا کہ جہان آباد تو تماشوں کا شہر بن گیا - میرے پڑدادا نے کہا کہ دنیا میں سب سے بڑھ کر

ظالم اور جاہل امتِ مسلمہ نے چنے ہیں۔ اس بزرگ نے ایسا کہا، پھر گریہ کیا، پھر گڑگڑا کر دعا کی کہ اے غفور الرحیم تو اپنے حبیبؐ کے صدقے میں اس اُمت کے گناہوں کو بخش دے ـــ شامتِ اعمال ماصورت نادر گرفت ـــ ایک کوکھ سے آخر کتنے نادر شاہ پیدا ہوں گے ـــ کامریڈ ـــ کامریڈ ـــ اے یار کامریڈ ـــ دروازہ تو کھول ـــ میں نے کتنا پکارا، کتنی کنڈی کھٹکھٹائی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ہار کر میں نے کنواڑ جھڑجھڑائے۔ دروازہ دھاڑ سے کھل گیا۔ جھلنگا چارپائی کے برابر بڑے سٹول پر اخباروں رسالوں کتابوں سے بھرا تھیلا رکھا تھا، مگر کامریڈ موجود نہیں تھا۔ میں حیران کہ کامریڈ گیا کہاں۔ میں اُسے اس کے سارے ٹھکانوں پر دیکھتا ہوا آرہا تھا۔ وہاں کہیں نہیں تھا۔ میں نے طے کیا کہ اسے گھر پر ہونا چاہیئے۔ مگر وہ یہاں پر بھی نہیں تھا۔ پھر کہاں گیا۔ میں وسوسے میں پڑ گیا۔ دن بھی تو خراب تھے۔ ابھی تک پتہ نہیں چلا تھا کہ نیو پلازا کا حادثہ کس کی کارستانی تھی۔ کتنی گرفتاریاں ہو چکی تھیں۔ کہیں کامریڈ بھی ـــ مگر میں نے فوراً ہی اس وہم کو رد کر دیا۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ روپوش ہو گیا ہو۔ ایک دفعہ پہلے بھی ہو گیا تھا۔ مجھے تشویش بھی تھی اور میں جز بز بھی تھا کہ آج جب میں واقعی سنجیدگی سے اس سے بات کرنا اور اس سے مشورہ لینا چاہتا تھا تو وہ غائب تھا میں مایوس ہو کر واپس ہونے لگا۔ میرے نکلنے سے پہلے ایک بدرنگ بلی میرے برابر سے نکلی اور تیزی سے میرا رستہ کاٹتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

کریسنٹ ہاؤس کی بلند و بالا عمارت کے سامنے کیا قیامت مچی ہوئی تھی۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں اندر سے نکل نکل کر باہر آرہے تھے۔ بھاگ رہے تھے۔

"ہوا کیا؟"

"بم"

"کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں۔ کسی نے فون کیا تھا۔"

نیو پلازا کے بعد سے کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا۔ مگر کسی وقت بھی کسی بھی دفتر میں کوئی نامعلوم فون موصول ہوتا۔ فوراً ہی بھگدڑ مچتی۔ دم کے دم میں عمارت میں الو بولنے لگتا۔

پراپرٹی ڈیلر۔ یہ شخص یہاں کیا کر رہا ہے۔ میں نے اس بھگدڑ میں اسے بریف کیس دربغل اطمینان سے گذرتے ہوئے دیکھا اور میں حیران ہوا کہ نیو پلازا میں جب واردات ہوئی تھی تو وہاں بھی اسی اطمینان سے گھوم پھر رہا تھا اور یہاں بھی اسی اطمینان سے چل پھر رہا ہے۔ میں حیران ہوا اور پھر پریشان ہوا کہ پھر مجھے آن دبوچے گا اور وہی پرانا سوال دہرائے گا کہ آشیانے کے بارے میں کیا سوچا ہے اور میں اور زیادہ تذبذب میں پڑ جاؤں گا۔ ابھی تو مجھے کامریڈ سے مشورہ کرنا ہے۔ ابھی میری اس سے ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔ میں وہاں سے تیزی سے نکل لیا۔ لیکن مجھے لگا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور لپک جھپک میرے پیچھے آ رہا ہے۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی اور تیز مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے احساس ہوا کہ بہت سے لوگ میرے آگے میرے پیچھے مجھ سے بھی تیز چل رہے ہیں۔ ایسے بھی ہیں۔ جو بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سانس پھولے ہوئے ہیں جو بھاگ رہے ہیں۔ ان کے سانس پھولے ہوئے ہیں۔ چہروں پر خوف کی تحریر لکھی ہوئی ہے۔ تب میں نے جانا کہ میرے اردگرد خوف کا ایک سمندر امنڈا ہوا ہے اور میں؟ مجھے اس خوف کے سمندر میں اپنے اوسان برقرار رکھنے چاہئیں۔ اسی آن بدرنگ بلی میرے برابر سے تیزی سے گذری اور بھگدڑ میں کھو گئی۔ ارے یہ یہاں بھی آ گئی۔ میں سخت متوحش ہوا۔ بدرنگ بلی ہو یا بدرنگ ہتھنی میں بدرنگ مخلوقوں سے ڈرنے لگا تھا اور مجھے ایک دم سے خیال آیا کہ کہیں یہ وہ بلی تو نہیں ہے اور میں اپنے تئیں خوف کا ایک سمندر بن گیا۔ تب میں نے دھیان کیا کہ میں اس بھگدڑ میں پھنس کر

کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ کب سے گھر سے نکلا ہوا ہوں۔ یہ غیر وقت ہے اور زمانہ خراب ہے۔۔۔۔ اور چاروں طرف بھگدڑ پڑی ہوئی ہے۔ میں ہوں کہ تنکے کی طرح رو میں بہہ رہا ہوں۔ بھگدڑ میں آدمی پھنس جائے تو اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔۔۔ نہ بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی جائے ہے۔۔۔ بس ایک ہی دائرے میں چکر کاٹتے رہو۔ جیسے بھنور میں تنکا۔ پھر اس سے مڈھ بھیڑ ہو جائے گی۔ وہی ایک سوال کہ گلستان محل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ کس اطمینان سے سوال کرتا ہے اور کتنا مجھے بے اطمینان کر دیتا ہے۔ اس بھگدڑ میں ایک اسے دیکھا کہ اطمینان سے پھر رہا ہے۔ اور وہ بدرنگ بلی وہ اس آشوب میں یہاں کیا کر رہی ہے۔ اموی دربار میں کیا کر رہی تھی۔ بھمبھل بھوسا۔ ایسے میں یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ کون کون ہے اور کون کیا کر رہا ہے۔ صورتیں پہچانی نہیں جاتیں یا یہ ہمارے عہد کا بھمبھل بھوسا ہے۔ میرے دادا کی سوچ واضح تھی اور قطعی چراغ حویلی نہیں بکے گی۔ بیشک برباد ہو جائے۔ میں نے رشک کیا۔ اے کاش میں مشتاق علی ہوتا۔ تب میں نے لمبا سفر کیا۔ چراغ حویلی اپنی روشن منڈیروں میناروں برجیوں کے ساتھ اور گلستان محل اور قصر ریحان اور بیت الابیض۔ پتہ تو چلے کہ کون کہاں تھا اور میں خیر۔ اب ہم اپنے آپ سے شروع ہوتے ہیں اور اپنے آپ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی اپنے آپ پر واضح نہیں ہو پاتے۔ بھگدڑ، زق زق، لق لق تب میں نے دھیان کیا کہ میں کہاں سے چلا تھا کہاں نکل آیا۔ یہ غیر وقت ہے اور زمانہ خراب ہے۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ جھٹپٹے میں صورتیں پہچانی نہیں جا رہی تھیں یا صورتیں بدل گئی تھیں۔ الٰہی وے صورتیں کیا ہوئیں۔ یہ صورتیں کیسی ہیں۔ صورتوں کو تکتا تھا اور حیران ہوتا تھا۔ پیشانی پر نظر گئی۔ دیکھا کہ وہاں داغ ہے۔ حیرانی سوا ہوئی۔ دوسری پیشانی، تیسری پیشانی۔ جو پیشانی دیکھی داغدار دیکھی۔ تب دل مبتلائے تشویش ہوا۔ وسوسوں نے نرغہ کیا۔ سو میں پوری بستی

میں گھوم گیا۔ پیشانیوں کو دیکھتا چلا گیا۔ سب پیشانیاں داغدار ہو چکی تھیں۔ یہ دیکھ دل داغ ہوا۔ الم بے حساب ہوا۔ پھر میں وسوسہ میں پڑ گیا کہ کیا وہ آگیا ہے۔ مگر کوہِ صفا۔ خیر کیا خبر ہے کہ وہ ..... ہاں کیا خبر ہے۔ تب فقیر نے افسوس کیا۔ مگر عین افسوس کے ہنگام خیال آیا کہ نادان یہاں کیوں خراب ہوتا ہے۔ شتابی سے اس قریے سے نکل چل۔ سو فقیر نے وہاں سے ڈیرا اٹھایا اور نکل چلا۔

اس قریے سے کس شتابی سے نکلا تھا۔ پر نکلتے نکلتے ایک وسوسہ دل میں پڑ گیا کہ کیا میری پیشانی بھی ..... جی سن سے نکل گیا۔ پھر اپنے تئیں سنبھالا، دل کو دلاسہ دیا کہ تو اُن میں سے تھا ہی نہیں۔ دل کو قدرے اطمینان ہوا۔ مگر پھر وہی وسوسہ۔ وسوسہ میں گھرا، ہرج مرج کھینچتا، رنج سفر اُٹھاتا کہاں کہاں پھرتا پھرا۔ سراغ اس خانہ برباد کو اس در کا نہ ملا۔ دل مبتلائے تشویش ہوا کہ وہ مسکن کہاں گم ہو گیا۔ وہ در و بام وہ اونچی ڈیوڑھی، وہ منڈیریں۔ دور کی آوازوں پہ کان لگائے کہ شاید کسی سمت سے کسی پیاسی بطخ کی آواز آجائے، یا کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی، یا شیاما چڑیا کے چہچہانے کی اور یوں سمت کا اندازہ ہو جائے۔ کوئی آواز نہ آئی۔ تب حیرانی سوا ہوئی۔ اور تشویش فزوں ہوئی کہ کیا اس منڈیر پہ بھی اب کوئی پرندہ نہیں اُترتا۔ مگر آخر کیوں۔ کیا ڈیوڑھیوں کے ساتھ شاد آباد منڈیریں بھی ویران بے آباد ہو جاتی ہیں۔ کیا ہوجاتا ہے کہ مکینوں کے نکل جانے پر منڈیروں پہ براجنے چہکنے والے پرندے بھی وہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔ پھر کوئی مردار چیل ہی وہاں آکر بیٹھے تو بیٹھے۔ مگر اس کے بیٹھنے سے تو ویرانی سوا ہوتی ہے۔ سو ہے سنتو پھر اس بیراگی نے ایک لمبی یاترا کی۔ نگر سے نکلا۔ بنوں میں بھٹکنے لگا۔ سب شور پیچھے رہ گئے۔ نر جن بن اور سناٹا۔ رین اندھیری، دور کنارہ، پورب گیا۔ پچھم گیا۔ پھر اتر، پھر دکھن چاروں کھونٹ کھوند ڈالے۔ اندھیکار ہی اندھیکار اور جل کی گرجتی دھار۔

ہے پربھو، اُجالا کہاں ہے۔ کنارہ کس اور ہے۔ یہی ایک چنتا۔ یہی ایک دھن۔ پر اُجالا اور کنارہ جیسے الوپ ہو گئے ہوں۔ دھرتی جل منڈل بنی ہوئی تھی جس استھان کو جا کے دیکھا واں پر جل تھل دکھائی دیا۔ پاٹھ شالا، دھرم شالا، کوٹ شالا محل دو محلا، سب ڈوب چکے تھے۔ جنگل پربت سب پانی میں سما گئے تھے۔ جیو جنتو پنچھی پکھیرو سب الوپ ہو گئے۔ پھر اُوپر نیچے دیکھا اور بھوچک رہ گیا کہ انبر کہاں گیا، دھرتی کس پاتال میں سما گئی۔ برہمانڈ کھانڈ کا کھلونا تھا کہ جل میں گھلتا چلا جا رہا تھا۔ جی ڈوبنے لگا کہ یہ تو سب کچھ ڈوبا جا رہا ہے۔ یہی ہوتا ہے۔ پانی جب چڑھتا ہے تو سب کچھ بہا کرے جاتا ہے۔ تو کچھ بچے گا بھی یا نہیں۔

نراشا کے اندھیکار میں بھٹکتا پھرتا تھا کہ ایکا ایکی آشا کی کونپل پھوٹی۔ دھیان میں ایک ہرا بھرا گھنا پیڑ اُبھرا جس کی چھاؤں میں ٹھنڈی مہکتی چھاؤں میں۔ ہاں بالکل، اس کی ٹھنڈی مہکتی چھاؤں ہی میں تو..... ہاں بالکل انہیں پانیوں میں تھا۔ ایسی ہی جل دھارا تھی۔ سارا کچھ ڈوب گیا تھا۔ پورا برہمانڈ۔ پر وہ ایک برکش پانیوں کے بیچ کھڑا تھا۔ اس کا کھوج لیا جائے کہ کہاں کس اور لہلہاتا ہے۔ مارکنڈے رشی سے پوچھا جائے۔ پھر ایک لمبی کٹھنائیوں بھری یاترا۔ پھر نرجن بن اور ایک بڑا سناٹا۔ نہ سادھو سنت، نہ رشی منی نہ پیر فقیر۔ سمادھیاں۔ کٹیاں تکئے سب ویران۔ کالے کوسوں کا سفر۔ بے فرسنگ بے منزل۔ دربدر خاک بسر سنگ دل زمین، بے اماں آسماں یا مظہر العجائب، صفا کی پہاڑی تو واقعی دو نیم ہو چکی ہے۔ کوئی پیشانی داغدار ہونے سے بچی بھی کہ نہیں۔ اور چہرے۔ کیا سب ہی..... اور یہ سروں کا سیلاب۔ مگر چھتوں تلے اماں نہیں تو آسماں تلے کہاں اماں ملے گی۔ بھگدڑ، چیخ پکار، زق زق بق بق دانت کٹکٹل۔ جیسے کوئی بڑی آگ تعاقب کر رہی ہو۔ تو کیا حاملہ اُونٹنیوں کے حمل گرنے کا وقت آ گیا ہے۔ پہاڑ سی رات اور بھیتا